© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

فہمِ قرآن

قرآن مجید نے خود اپنے تئیں آسان کہا ہے ارشاد ہے :-

وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ اور تحقیق ہم نے قرآن مجید کو سہل کر دیا تاکہ لوگ اُس سے نصیحت حاصل کریں تو کیا کوئی ہے نصیحت حاصل کرنیوالا۔
فَهَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ

یہ آیت سورۃ "القمر" میں متعدد بار آئی ہے۔ سورۃ کے شروع میں قیامت کا ذکر ہے اور اُن لوگوں پر شدید نفرت کا اظہار کیا گیا ہے جو اپنی خواہشات کی پیروی میں دن رات مشغول رہتے ہیں اور داعی حق کی آواز کو بالکل نہیں سنتے پھر علی الترتیب قوم نوح، عاد، ثمود اور قوم لوط کی نافرمانی و سرکشی اور قہر الٰہی سے ان کے تباہ و برباد ہو جانے کا بیان الگ الگ ایسے انداز میں کیا گیا ہے جس کو سن کر سخت سے سخت منکر کا بھی دل لرز جائے اور ہر واقعہ کو ذکر فرمانے کے بعد بطور تنبیہ دریافت کیا گیا ہے

فَکَیْفَ کَانَ عَذَابِیْ وَنُذُرِ (دیکھو) میرا عذاب دینا اور ڈرانا (اُن کے حق میں) کس طرح پورا ہوا۔

فَهَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ ۔ پس کیا کوئی ہے (اس سے) نصیحت حاصل کرنیوالا؟

اور مذکورۂ بالا آیت میں نصیحت حاصل کرنے کے لیے قرآن کی آسانی اور سہولت کو بیان فرما کر اُس سے سبق لینے کی دعوت دی گئی ہے

ایک اور موقع پر سورۂ "مریم" میں ارشاد ہے :-

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنذِرَ بِهِ قَوْمًا لُّدًّا

اور تحقیق ہم نے قرآن مجید کو تمہاری زبان میں آسان کر دیا ہے تاکہ تم اُس کے ذریعہ پرہیزگاروں کو بشارت سُناؤ اور جھگڑالو قوم کو ڈراؤ دھمکاؤ۔

اب اِن دونوں آیتوں کے نفسِ مطلب اور ان کے سیاق و سباق پر غور کیجیے تو یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید کی زبان میں اُس کے آسان ہونے کے معنی کیا ہیں؟ پہلی آیت کا سباق اور اُس کا ماقبل سے ربط آپ کو معلوم ہو چکا ہے۔ اُس سے صاف طور پر یہی متبادر ہوتا ہے کہ قرآن مجید رشد و ہدایت کی آسان کتاب ہے۔ اُس میں عبرت و بصیرت کے لیے جگہ جگہ اقوام کہن کے واقعات کا بیان ہے، اور خدا کے وجودِ حق کو ثابت کرنے کے لیے قدرت کی ایسی واضح نشانیاں بتائی گئی ہیں جن کا ایک ایک ذرہ مبدأ فیاض کے وجود و ثبوت اور اُس کی قدرت بے مثال کا زبانِ حال سے اعلان کر رہا ہے۔ یہ سب باتیں اُن کو قرآن مجید سے ہی معلوم ہوتی ہیں اس لیے اس عالم کون و فساد میں ہدایت کا سرچشمہ قرآن مجید ہی ہوا۔ تو کیا پھر کوئی ہے جو اس سے موعظت گیر ہو اور نصیحت حاصل کرے؟

پانی کا برسنا، برق کی چمک، رعد کی گرج، دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن کا آنا آفتاب کا مشرق سے طلوع کرنا اور مغرب میں غروب ہو جانا، موسموں کا تغیر و تبدل، انسان کا عدم سے وجود میں آنے کے لیے کن کن مراحل سے گزرنا، چشموں کا اُبلنا، کھیتوں کا سرسبز و شاداب ہونا، پتھروں سے پانی کا پھوٹ کر نکلنا، اور اونٹ کی عجیب و غریب خلقت یہ اور اسی طرح کی دوسیکڑوں نشانیاں جو قرآنِ مجید میں مذکور ہیں، ایک انسان بار بار اُن کو دیکھتا ہے لیکن اُس کا ذہن اُن کے صانع و خالق کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔ قرآن حکیم نہایت فصیح و بلیغ پیرایۂ بیان میں اُن کا ذکر کرتا ہے اور لوگوں کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دعوت دیتا ہے کہ وہ ان سب چیزوں کے اصل منشا و باعث اور اُن کی علتِ فاعلہ پر غور کریں ظاہر ہے یہ چیزیں مشاہدات سے تعلق رکھتی ہیں، اور ان کا دیکھنا، سمجھنا، ان سے خُدا کے وجود پر استدلال کرنا، چنداں مشکل و دشوار نہیں ہے۔ صرف ضرورت اس کی ہے کہ آدمی اس طرف متوجہ ہو پس اسی بنا پر قرآن مجید نے اپنے تئیں آسان کہا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ تیسر قرآن کا ذکر کرکے للذکر یعنی نصیحت کے لیے" فرمایا گیا، اور پھر ارشاد ہوا، فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ؟

دوسری آیت جو اوپر نقل ہوئی ہے اُس کا مفہوم بھی یہی ہے۔ چنانچہ صاف طور پر ارشاد گرامی ہوتا ہے:-

لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَ تُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ۔ ہم نے قرآن کو اس لیے آسان کیا ہے کہ آپ اس کے ذریعہ پرہیزگاروں کو خوشخبری سنائیں اور جھگڑالو لوگوں کو ڈرائیں۔

مقصد یہ ہے کہ قرآن مجید میں ترغیب و ترہیب سے متعلق جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ اس قدر صاف، واضح اور روشن ہیں کہ وہ لوگ جن کے دل میں عناد و تعصب کے شعلے نہیں بھڑک رہے ہیں اُن کو سُن کر شاد کام فلاح ہو جائینگے اور جو فرط عداوت سے انکار و جحود کی قسم کھا بیٹھے ہیں اُن کو قرآن کی آیات وعید سُن کر تنبہ ہوگا، اور وہ سمجھینگے کہ جو قادر مطلق عاد و ثمود کی سرکش قوموں کو صفحۂ ہستی سے بے نام و نشان کر سکتا، اور قوم لوط پر پتھروں کی بارش کرکے اُنھیں مسمار کر سکتا ہے وہ ان سرکشوں کے ساتھ بھی اگر چاہے تو یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

اس تقریر سے ثابت ہے کہ قرآن مجید کے سہل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اُس کی تعلیمات آسان ہیں۔ وہ جن حقائق کی طرف لوگوں کو متوجہ کرتا ہے وہ فلسفہ کے اصول موضوعہ کی طرح مخفی نہیں، بلکہ ہر ایک پر واضح ہیں۔ پھر اُن پر عمل کرنا بھی دشوار نہیں۔ کیونکہ قرآن کی راہ اصل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فطرت کی راہ ہے اور اُس کی روش وہی ہے جس کی طرف ہر انسان کی فطرتِ سلیمہ دعوت دیتی ہے

جہاں تک قرآن مجید کی نفس تعلیم کا تعلق ہے وہ بے شبہ اس قدر آسان ہے کہ ہر شخص خواہ عالم ہو، یا غیر عالِم، عربی ہو یا عجمی اُن کو معلوم کر سکتا ہے۔ مثلاً نماز پڑھو، روزہ رکھو، حج کرو، والدین اور اعزا و اقربا کے ساتھ احسان و کرم کا معاملہ کرو، شراب نہ پیو، زنا سے بچو، وعدہ پورا کرو، بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی سے پیش آؤ۔ یہ وہ احکام ہیں جن کو ایک عربی داں جس طرح سمجھ سکتا ہے۔ ایک غیر عربی داں بھی اُردو یا کسی اور زبان میں ترجمہ دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ "فہمِ قرآن" کے معنی کیا یہی ہیں کہ قرآن مجید کو پڑھ کر بعض چیزوں کے متعلق حسن و قبح کے احکام معلوم ہو جائیں اور بس۔ اگر واقعی مراد یہی ہے تو پھر ہمیں اختلاف کی کوئی ضرورت نہیں۔ مگر ظاہر ہے یہ مُراد نہیں ہے۔ بلکہ فہم قرآن سے غرض یہ ہے کہ انسان مجتہدانہ طور سے احکام کا استنباط کر سکے، قرآن کی کسی آیت کو پڑھ کر اُس کے واقعی اور حقیقی مفہوم کو تعین کر سکے، اس کے معیار بلاغت کو دریافت کر کے یہ سمجھ سکے کہ یہاں کلام کا مقتضیٰ حال کیا ہے اور کسی چیز پر زیادہ زور دینا منظور ہے۔ اس کا مدلول مطابقی اور مدلول التزامی کیا ہے، اور یہاں مراد کیا ہے، تو یہ بات یقینی ہے کہ اس مراد و غرض کے اعتبار سے فہم قرآن کسی ترجمہ کے دیکھ لینے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کے لیے خاص خاص شرائط و آداب ہیں کہ جب تک وہ نہ پائے جائیں کوئی شخص فہم قرآن کا مدعی نہیں ہو سکتا۔

ان شرائط و آداب میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری عربیت کا ذوق کامل ہے یہ ذوق صرف مقامات حریری، دیوانِ متنبی اور دیوان حماسہ۔ یا ایم اے عربی کورس کے پڑھ لینے سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ایک مدت دراز درکار ہے۔ ذوق سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کو عربی کلام پڑھتے وقت وہی لذت و سرور حاصل ہو جو اُس کو خود اپنی زبان کا اچھا شعر سُن کر حاصل ہوتا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ عربی کے تمام محاورات، اُن کے مواقع استعمال سے پورا واقف ہو۔ ایک مفہوم کو مختلف طریقوں سے بیان سے ادا کیا جا سکتا ہے وہ جانتا ہو کہ ہر طریقہ کو دوسرے طریقۂ بیان پر کیا تفوق حاصل ہے۔ فرض کیجیے ایک جملہ تین لفظوں سے مرکب ہے۔ زید، آیا اور آج۔ ہر صاحب ذوق جانتا ہے کہ ان میں ترتیب بدل دیجیے تو جملہ کا مفہوم ہی بدل جاتا ہے۔ ذوق سے غرض یہ ہے کہ وہ ان باریک باریک فروق سے بھی واقف ہو۔

بعض اوقات کسی کلام میں کوئی لفظ محذوف ہوتا ہے اور اس بنا پر مختلف معنیٰ مراد لیے جا سکتے ہیں لیکن اہل زبان کے نزدیک اُس کا صرف ایک ہی مفہوم ہو سکتا ہے اور وہاں وہی مُراد ہوتا ہے۔

حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں کا واقعہ ہے۔ آپ نے ایک مرتبہ اپنے کسی پشاوری مرید سے جس کو دہلی میں رہتے ہوئے عرصہ ہو گیا تھا۔ فرمایا "میاں ذرا صراحی اُٹھا لانا اور دیکھنا پیٹ پکڑ کر اُٹھانا" مرید نے ایک ہاتھ سے صراحی کی گردن پکڑ لی اور دوسرے ہاتھ سے اپنا پیٹ پکڑ لیا اور اس شان سے صراحی حضرت اقدس کے سامنے لا کر رکھ دی۔ حضرت مرزا صاحب کے فقرہ بالا میں "صراحی کا" لفظ محذوف ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ صراحی کا پیٹ پکڑ کر اُٹھانا۔ جو لوگ زبان کا ذوق رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہاں صراحی کا لفظ محذوف ہی ہونا چاہیے تھا اگر اُس کو ذکر کر دیا جاتا تو لطف کلام جاتا رہتا۔

اب خیال فرمایے اگر وہ پشاوری مرید اپنے استدلال میں یہ کہتا کہ آپ نے صرف پیٹ کہا تھا، یہ نہیں بتایا کہ کس کا؟ صراحی کا یا میرا اپنا، اس بنا پر دونوں مفہوم مراد ہو سکتے تھے پس اگر میں نے اُن میں سے ایک کو متعین کر لیا تو اس میں میری کیا خطا ہے۔ تو بتایئے آپ اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پشاوری مریدکے استدلال کا کوئی منطقی جواب دے سکتے تھے؟ ہرگز نہیں۔ آپ کے پاس بجز اس کے کوئی جواب نہ تھا کہ آپ اُس کو دہلی یا لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کا حوالہ دیتے اور کہتے کہ کسی زباں داں سے پوچھو اس طرح کا جملہ بولتے ہیں تو وہاں پیٹ سے مُراد اپنا پیٹ ہوتا ہے یا مراحی کا؟

اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک لفظ بولا جاتا ہے لیکن کسی خاص موقع پر اُس سے مُراد اُس کے اصل معنی نہیں ہوتے بلکہ اُس کے برخلاف اُس کی ضد مُراد ہوتی ہے۔ مثلاً آپ ایک مریض کے پاس اُس کی عیادت کے لیے جائیے اور پوچھیے، کیا حال ہے؟ مریض جواب میں کہتا ہے: "اچھا ہوں"۔

اہلِ ذوق سے پوشیدہ نہیں کہ اس جملہ کے دو متضاد مفہوم ہو سکتے ہیں۔ فرق صرف لب و لہجہ کا ہے۔ اگر مریض نے بیماری کی درازی اور صحت سے مایوسی کے عالم میں حسرت آمیز لہجہ سے "اچھا ہوں" کہا ہے تو اُس کا مطلب یہ ہے کہ میں اچھا نہیں ہوں۔ اس وقت مریض کا یہ اچھا کہنا شعر ذیل کا مصداق ہے۔

پوچھنے والوں نے میرا ناک میں دم کر دیا　　　جس نے پوچھا حالِ دل کہنا پڑا کچھ بھی نہیں

اور اگر بیمار نے انبساطِ خاطر کے ساتھ اپنے تئیں اچھا کہا ہے تو اُس کا مطلب یہ ہے کہ واقعی وہ اب اچھا ہے۔

بسا اوقات جملہ استفہامیہ بولا جاتا ہے، اور اس سے غرض کسی شے کے متعلق کچھ دریافت کرنا بھی ہو سکتا ہے اور استفہام انکاری کے طور پر کسی سے انکار کرنا۔ یا بطورِ استفہام اقراری کسی بات کا اقرار کرنا بھی مُراد ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک شخص جو زبان کے ذوق سے بہرہ وافر رکھتا ہو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُس جملہ کو سُنتے ہی معلوم کرلیتا ہے کہ یہاں متکلم کی مراد یہ ہے۔ علمارِ بلاغت نے اسی بنار پر سچ کہا ہے کہ الفاظ میں ترادف ہے ہی نہیں۔ اور ایک کلام کا مطلب صرف ایک ہی ہوسکتا ہے غیر زباں داں طرح طرح کی تاویلیں اور دور از کار توجیہیں کرتا ہے لیکن صحیح مخاطب جب اُس کلام کو سُنتا ہے تو فوراً ایک ہی مفہوم متعین کرلیتا ہے اور اُس کو توجیہات مختلفہ کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے پھرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔

پھر اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کیجیے کہ بلاغت کے مدارج و مراتب لامحدود ہیں یعنی کسی کلام کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ اس پر بلاغت ختم ہے۔ کیونکہ بلاغت کی تعریف ہے کلام کا مقتضئ حال کے مطابق ہونا، اور ذرا ذرا سے فرق سے حال اور مقتضئ حال کی مطابقت کی اس قدر قسمیں پیدا ہوتی ہیں کہ اُن کا کوئی شمار ہی نہیں ہوسکتا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ فلسفۂ اخلاق میں کسی قوت کے اعتدال سے جو ملکہ پیدا ہوتا ہے فضیلت کہلاتا ہے۔ اور اس کے برخلاف قوت کی افراط یا تفریط سے جو ملکات پیدا ہوتے ہیں رذائل کہلاتے ہیں لیکن کسی ملکہ کا اچھا یا بُرا ہونا ایک دوسرے کے اعتبار سے ہی متصور ہوسکتا ہے۔ درحقیقت اُس کے اقسام کی تحدید و تعیین نہیں کی جاسکتی۔ تھوڑے تھوڑے فرق و امتیاز سے اور قوت کے اعتدال کی کمی بیشی کے لحاظ سے جس طرح رذائل بے شمار نکل آتے ہیں فضائل بھی اُن کے بالمقابل ناقابلِ شمار پیدا ہوجاتے ہیں، ٹھیک یہی حال بلاغت کے مدارج و مراتب کا ہے۔ ایک کلام خواہ کتنی ہی بلاغت رکھتا ہو، کسی دوسرے کلام سے کمتر ہوسکتا ہے۔ ایک طرف بلاغت کے مدارج کا لامحدود ہونا پیشِ نظر رکھیے۔ اور دوسری طرف علمار بلاغت کا یہ فیصلہ دیکھیے کہ قرآن مجید بلاغت کے اُس انتہائی مرتبہ کو حاوی ہے جو کسی کلام کے لیے انتہائی سے انتہائی مرتبہ بلاغت ہوسکتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس تقریر سے واضح ہوگیا ہوگا کہ عربیت کے ذوق صحیح سے مُراد کیا ہے؟ مقصد یہ ہے کہ ائمۂ عرب کے کلام کی مزاولت و ممارست سے ایک ایسا پختہ ذوق پیدا ہو جائے کہ وہ عربی کلام کے مدلول و منطوق کو پورے طور پر سمجھ سکے۔ اُس کے اشارات و کنایات سے واقف ہو، الفاظ کا صحیح مفہوم متعین کر سکے اور صرف یہی نہیں بلکہ اُس کو فصیح و بلیغ کلام سُن کر حقیقۃً حظ آئے، اور بُرے کلام سے اُس کے ذوق کو صدمہ پہنچے۔ مومن کا یہ شعر مشہور ہے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا   جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ہم اور آپ اس کو پڑھتے ہیں اور بقدر ذوق اُس سے لطف بھی اُٹھاتے ہیں لیکن مرزا غالب نے اس کو سُنا تو بیتاب ہوگئے۔ یہاں تک کہ اس شعر کے بدلے میں اپنا پورا دیوان ہی دینے پر آمادگی کا اظہار کرنے لگے پس یہ ظاہر ہے ایک شخص کا ذوق جتنا زیادہ لطیف و پاکیزہ ہوگا اُسی قدر وہ کلام بلیغ سے زیادہ محظوظ و شاد کام ہوگا، اور اُس کو زیادہ سے زیادہ باریکیاں نظر آئینگی۔

اس طرح کا ذوق عربیت سالہا سال کی عرقریزی محنت و کاوش عمیق و وسیع مطالعہ اور بہترین دماغی و ذہنی صلاحیتوں کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ اور چونکہ قرآن مجید بلاغت کے مرتبۂ قصویٰ پر حاوی ہے، اس لیے کوئی شخص بجز اُن بزرگانِ کرام کے جن کو خود صاحبِ قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مشکوٰۃ نبوت سے منور کیا ہو ادعوے کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ کسی آیت کا مطلب وہی ہے جو اُس نے سمجھا ہے۔

آج ہر شخص کو زبان و قلم کی آزادی حاصل ہے جو جی میں آتا ہے کہہ گزرتا ہے اور اُس کو اپنی طباعی و جودت قلم کی داد لینے کے لیے سب سے زیادہ آسان قرآن مجید ہی نظر آتا ہے لیکن جو چیز آج سب سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زیادہ سہل ہے، کل علمائے حق کے لیے سب سے زیادہ مشکل اور احتیاط طلب تھی۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں "میں نے فقہائے مدینہ کو دیکھا کہ تفسیر قرآن کے باب میں بہت زیادہ احتیاط برتتے تھے۔ ان میں سالم بن عبداللہ، قاسم بن محمد، سعید بن المسیب اور نافع خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

حضرت شعبی فرماتے تھے: "تین چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق میں مرتے دم تک کچھ نہیں کہہ سکتا۔ قرآن، روح، اور قیاس (ابن جریر ج ۱ ص ۲۹)

اصمعی کو سب جانتے ہیں عربی لغت و ادب کا کتنا بڑا امام ہے۔ برسوں تحقیق لغات اور صحیح محاورات اور اُن کے معانی کی فکر میں عرب کے جنگلوں کی خاک چھانتا پھرا ہے اور لفظ لفظ کے لیے عرب کے بدوؤں میں برسوں تک قیام کیا ہے لیکن اس کے باوجود قرآن مجید کی تفسیر میں بالکل خاموش رہتا تھا۔ اس سے قرآن مجید کی کسی آیت کی نسبت دریافت کیا جاتا تو کہتا: "عرب اس کے یہ معنی بیان کرتے ہیں، میں نہیں جانتا اس سے مراد کیا ہے"۔ (المزہر ج ۲ ص ۱۶۲)

ابو الطیب کہتا ہے: "اصمعی سخت خدا پرست تھا۔ وہ قرآن کی کسی آیت کی تفسیر نہ کرتا تھا۔

اِن اکابر علم و ادب کی یہ احتیاط کوشی دیکھیے اور اس کے بالمقابل آج کل کے ایک بزعم خود غلط گریجویٹ کا ادعا ملاحظہ فرمائیے۔ آپ فرماتے ہیں:۔

> "آج ایک گریجویٹ کو عربی ادب سے واقف کر کے دو سال بطور خود اسلامی مذہبی علوم کا مطالعہ کرنے کے لیے چھوڑ دو تو اگرچہ وہ آپ کی طرح علم و تقویٰ کا مدعی تو نہیں ہوگا لیکن وہ اسلام کو ہزار درجہ اُس قابل عربی داں کے بہتر سمجھیگا جس نے ابتداء میں قال اقول سے سر مارا اور آخر میں قال رسول اللہ سے"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"مذہب اسلام کے سمجھنے کے لیے فلسفہ مذہب، تاریخ مذہب، اقوام سامیہ کا لٹریچر، تاریخ انقلاب و علم انساب کی ضرورت ہے جو دیوبند یا ندوہ کی دسترس سے باہر ہے۔ مگر جو ایک انگریزی داں کے لیے ایک معمولی بات ہے"۔

جو لوگ دین کے معاملہ میں اس درجہ تساہل واقع ہوئے ہیں، غور کریں کہ دنیوی معاملات میں خود اُن کی تقلید کا کیا عالم ہے، آپ کسی شخص کو اس وقت تک ڈاکٹر تسلیم نہیں کرتے جب تک کہ اُس نے باقاعدہ کسی اسکول یا کالج میں ڈاکٹری کا کورس پورا نہ کیا۔ کسی شخص کے قانونی مشورہ کو اُس وقت تک درخور اعتنا نہیں سمجھتے جب تک کہ اُس نے باقاعدہ وکالت یا بیرسٹری کا امتحان پاس نہ کیا ہو۔ پھر ڈگری کی حیثیت کے اعتبار سے ڈگری یافتہ کے اعزاز و اکرام میں بھی فرق مراتب کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ ہندوستان کے ایم بی بی ایس یا ایل ایل بی کے قول کا وہ وزن نہیں ہوتا جو انگلینڈ کی کسی طبی ڈگری یا بیرسٹری کے ڈپلومے والے کا ہوتا ہے۔ "نیم حکیم" کے قول کو آپ "ہمیشہ خطرۂ جان" سمجھتے ہیں۔ پھر حیرت ہے کہ دین کے معاملہ میں آپ "نیم مولوی" کے فتوے کو "خطرۂ ایمان" قرار نہیں دیتے۔ ترجمہ کی مدد یا عربی کی معمولی شُدبُد حاصل کر لینے سے کسی کو یہ حق ہرگز نہیں پہنچتا کہ وہ مدعیانہ رنگ میں اُن لوگوں سے دو چار ہو جنہوں نے اپنی عمریں انہی علوم اسلامیہ کی خدمت میں بسر کی ہیں، اور جنہوں نے اپنی زندگی کی تمام راحتوں اور آسایشوں کو برباد کر کے قرآنی حقائق و معانی کی چھان بین میں خون پسینہ ایک کیا ہے یہ ہو سکتا ہے، کہ آپ سائل کی حیثیت سے اپنے شکوک و شبہات کو علماء کرام کے سامنے پیش کریں، اور اُن سے جواب طلب ہوں، لیکن آپ کے لیے یہ کبھی جائز نہیں ہو سکتا کہ چند مخصوص خیالات کو ذہن میں رکھ کر عربیت سے بالکل ناواقف ہو جانے کے بعد آپ مجتہدانہ رنگ میں کلام کرنے کے خوگر ہوں، اور جس امام کی بات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آپ کے خیال کے مطابق نہ ہو آپ اُس پر بے تکلف تبرا شروع کر دیں۔ بس آپ کے لیے دو صورتوں کے سوا کوئی اور تیسری صورت نہیں ہے۔ یا خود عربیت کا ذوق پیدا کیجیے۔ علوم اسلامیہ کی تکمیل کر کے اُن میں بصیرت و نظر حاصل کیجیے۔ اور اگر یہ نہیں ہے تو ائمۂ اسلام پر اعتماد کیجیے اور اُن کی بات مانیے آج یہ وہ شخص جو فہم قرآن کا مدعی ہے اُس کو بتانا چاہیے کہ وہ کہاں تک اس دعوے کا اہل ہے قرآن بیشک آسان ہے لیکن کسی شے کے آسان ہونے کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اُس کے سمجھنے کے لیے نہ اُس کے مبادی جاننے کی ضرورت ہے اور نہ اُس کے لیے کچھ اصولِ موضوعہ ہیں جن کو سمجھنا اور غور کرنا ضروری ہو۔

امام ابوبکر الباقلانی فرماتے ہیں :-

من زعم انّہ یمکنہٗ ان یفہم	جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ وہ خود بلاغت کی مشق و
شیئًا من بلاغۃ القرآن	مہارت کیے بغیر قرآن مجید کی بلاغت کو تھوڑا
بدون ان یمارس البلاغۃ	بہت سمجھ سکتا ہے، وہ جھوٹا اور باطل گو
بنفسہ فھو کاذبٌ مُبطِلٌ	ہے۔

امام موصوف نے تو صرف بلاغت قرآن تک ہی بات محدود رکھی ہے۔ علامہ سید رشید رضا نے تفسیر المنار میں لکھا ہے کہ عربیت کے بغیر کوئی شخص قرآن مجید سے نصیحت پذیر بھی نہیں ہو سکتا، کہتے ہیں :-

لا یتعظ الانسان بالقرآن فتطمئن نفسہٗ	کوئی شخص قرآن سے نصیحت پذیر نہیں ہو سکتا بایں معنی کہ اس کا
بوعدہٖ وتخشع لوعیدہٖ الا اذا عرف معانیہ	نفس قرآنی وعدوں پر مطمئن ہو جائے اور وعید سے لرز جائے جب تک
وذاق حلاوۃ اسالیبہٖ	کہ وہ اس کے معانی کو سمجھنے کی اہلیت پیدا نہیں کر لیتا اور اس کے
	طریقہائے بیان کی شیرینی محسوس نہیں کرنے لگتا۔

(باقی)

© rasailojaraid.com